تذکرہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تعالیٰ

مؤلفِ تفسیر "مظہری"

ڈاکٹر محمود الحسن عارف

ادارہ ثقافت اسلامیہ

۲۔ کلب روڈ، لاہور

تذکرہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ تعالیٰ

مؤلفِ تفسیر "مظہری"

ڈاکٹر محمود الحسن عارف

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
۲- کلب روڈ، لاہور

طبع اول:	1995ء
تعداد:	550
ناشر:	ڈاکٹر رشید احمد جالندھری ناظم ادارہ ثقافت اسلامیہ
مطبع:	طیبہ پرنٹرز لاہور
قیمت:	300 روپے

اس کتاب کی طباعت و اشاعت اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد
کی مالی معاونت کی بدولت ممکن ہوئی۔ شکریہ!

انتساب

اپنے والد محترم

میاں عمر دین

(المتوفی ۱۹ مارچ ۱۹۸۴ء)

کے نام

جن کی محبت و شفقت نے زندگی
کی اونچی نیچی راہوں پر چلنا سکھایا۔

(مؤلف)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

ایک ایسے وقت میں جب عالمِ اسلام اندرونی اور بیرونی خطرات میں گھرا ہوا کسی غیبی اور آسمانی امداد کا منتظر ہے۔

ایک ایسے وقت، جب ملّتِ اسلامیہ کسی مخلص اور بے لوث قیادت کی منتظر ہے۔

ایک ایسے وقت جب مغرب نے، عالمِ اسلام پر غیر اعلان کردہ صلیبی جنگ مسلط کر رکھی ہے اور پوری دنیائے اسلام میدان کارزار کا منظر پیش کر رہی ہے۔

ایک ایسے وقت، جب بہت سے مظلوم مسلمان ملکوں کی ستم رسیدہ خواتین کی آہوں اور سسکیوں سے عرشِ بریں کانپ رہا ہے اور مسلمان کسی نجات دہندہ کے منتظر ہیں خاکسار اپنی یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔

یوں تو برصغیر پاک و ہند کی خاک سے ہزاروں نفوس قدسیہ، لاکھوں علماء، حفّاظ اور رجالِ کار نے جنم لیا۔ جن کے تذکروں سے کتب سیر و تذکرہ معمور ہیں۔ مگر ان میں ایسی ہستیاں، جنہوں نے کوئی تاریخی کارنامہ سرانجام دیا اور جریدۂ عالم پر اپنے نام کو مہر دوام و بقا سے ثبت کیا۔ کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ ہماری اس کتاب کے موضوع قاضی محمد ثناء اللہ تلمیذ رشید شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ اور خلیفۂ اعظم و فیض تربیت یافتہ مرزا مظہر جانجاناںؒ کا شمار انہی تاریخِ علم و ادب کی گرانقدر شخصیتوں میں ہوتا ہے۔

قاضی صاحبؒ ۴۵ کے قریب چھوٹی بڑی کتابوں کے مصنّف ہیں۔ جن میں سب سے بڑی "تفسیرِ مظہری" ہے، جسے بین الاقوامی شہرت اور پذیرائی حاصل ہو چکی ہے۔

قاضی صاحب نے جنہیں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی "بیہقی وقت" کہا کرتے تھے، اس تفسیر میں بہت سے علوم و فنون کو محفوظ اور مدون فرما دیا ہے۔ مگر شومئ قسمت سے ان کے متعلق ہماری معلومات چند صفحات سے زیادہ نہ تھیں۔ ان حالات کو سامنے رکھ کر خاکسار کو قاضی صاحب کی شخصیت و سوانح پر، کام کرنے کا شوق ہوا جو بحمد اللہ پانچ برسوں کی محنت و کاوش کے بعد اپنے انجام کو پہنچا جس پر جامعۂ پنجاب کی طرف سے، خاکسار کو اعلیٰ ترین علمی سند (پی ایچ ڈی) عطا ہوئی۔ بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ اگر اس مقالے کو ضروری ترمیم و اضافے کے ساتھ شائع کر دیا جائے تو وہ اہلِ علم کے لئے بے حد مفید ہوگا۔ اس طرح قلم ایک بار پھر ہاتھ میں پکڑا اور اس کو کتابی شکل میں مرتب کیا۔ نتیجہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔

نامناسب ہوگا اگر اس موقع پر اپنے ان محسنوں کا شکریہ ادا نہ کروں، جنہوں نے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں میری مدد کی۔ اس طویل فہرست میں شیخ محترم مولانا عبدالمجید صاحب (شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ، باب العلوم کہروڑ پکا)، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر (موجودہ پرنسپل و ڈین اورنٹیل کالج لاہور) ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم (سابق صدر شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ) پروفیسر عبدالقیوم مرحوم (سابق استاد عربی اورنٹیل کالج لاہور) ڈاکٹر عبدالغنی مرحوم (استاد فارسی گورنمنٹ کالج لاہور) اور ان کے فرزند ارجمند جناب اکرام الحق، مولانا الیف اللہ عثمانی (فاضل دارالعلوم دیوبند، ساکن سرگودھا)، جناب محمد اقبال مجددی (اُستاد فارسی، ایم اے او کالج، لاہور) ڈاکٹر ایس ساجدہ علوی (اُستاد فارسی، ایم سی گل یونیورسٹی کینیڈا) پنجاب یونیورسٹی کے لائبریرین جناب سید محمد جمیل رضوی، پروفیسر محمد علی،

(استاد انگریزی، ایچی سن سکول لاہور) وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

اس کی طباعت کے ضمن میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کے موجودہ ڈائرکٹر رشید جالندھری اور جناب پروفیسر محمد اسحاق بھٹی کا اگر تعاون حاصل نہ ہوتا تو یہ علمی کام شاید قارئین کرام تک اتنے خوبصورت اور عمدہ طریقے پر نہ پہنچ پاتا۔

اللہ تعالے ان تمام حضرات کو اس کارِ خیر میں شرکت پر اجرِ عظیم عطا فرمائے آمین

ڈاکٹر محمود الحسن عارف
دار العرفان
رحمان پارک، گلشن راوی ۔ لاہور

فہرست عنوانات تذکرہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

مقدمہ

تعارف و پس منظر

مولد و مسکن - پانی پت

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتیؒ ہندوستان کے مشہور اور مردم خیز شہر "پانی پت" میں پیدا ہوئے اور یہیں اسّی سال سے زیادہ عمر پا کر وفات پائی۔ پانی پت کا یہ شہر صدیوں سے آباد چلا آتا ہے[1] ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک یہ شہر بجائے کرنال کے ضلعی (پرگنہ کا) صدر مقام رہا۔

قاضی صاحبؒ کے زمانے میں یہ شہر چار بڑے حصّوں میں تقسیم تھا، یہ تقسیم زیادہ تر خاندانی اور پیشہ ورانہ تفریق پر مبنی تھی، انصاریوں کے محلّہ قاضیاں میں قاضی صاحبؒ کی رہائش تھی[2]

انتظامیہ

مغلیہ عہد میں ضلعی صدر مقام ہونے کی بنا پر یہاں ضلعی دفاتر قائم تھے، یہ دفاتر اب

---

[1] مولانا محمد میاں (پانی پت اور بزرگانِ پانی پت، مطبوعہ پانی پت، ص ۵) نے اس کا بانی راجا ارجن کو قرار دیا ہے جو ہندوستان کے عہدِ عتیق کا مشہور سیناپتی (سپہ سالار) تھا، مگر کسی اور ذریعے سے اس کی تائید نہ ہو سکی۔

[2] عبدالحی: دہلی اور اس کے اطراف، ص ۸۵۔

"باغ کیابل" کے پاس شکستہ صورت میں موجود ہیں۔ یہیں وہ کچہری تھی۔ جس میں قاضی صاحب اپنے زمانے میں مسندِ عدالت پر بیٹھا کرتے تھے۔ یہ علاقہ ہر زمانے میں مرکزِ سلطنت دہلی کے ماتحت رہا۔ مقامی طور پر ایک تنبع دار (عامل) اور ایک یا دو قاضی یہاں تعینات کیے جاتے تھے۔

تعلیم

مذہبی اور قرآن کی تعلیم کے لیے یہ شہر بڑی شہرت رکھتا ہے۔ یہاں بدولت تعلیم قرآن جاری ہونے کی بنا پر ایک خاص لہجہ پیدا ہوا، جسے "پانی پتی" لہجہ کہا جاتا ہے۔ قاضی صاحب نے ابتدائی تعلیم اسی شہر میں حاصل کی۔ متاخر عہد (شعبان ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء) کے ایک سفرنامے کی رُو سے اس شہر میں ایک سو چودہ مساجد، آٹھ سو سے زیادہ حُفّاظ اور تدریس قرآن کے متعدد مدرسے موجود تھے[۳]۔ جدید تعلیم کا آغاز انگریزی حکومت کی عمل داری میں آنے کے بعد ہوا۔

پیشے: زراعت

اس علاقے کے لوگ زیادہ تر زراعت پیشہ ہیں، یہاں کے زمینداروں میں مخدوم زادے، انصاری (قاضی صاحب کا ننھیالی خاندان)، افغان اور راجپوت شامل ہیں[۴]۔ خود قاضی صاحب کا مستقل ذریعہ آمدنی زراعت تھا۔ زمینوں کو نہری اور چاہی دونوں طریقوں سے کاشت کیا جاتا تھا، تاہم آس پاس کا بہت بڑا علاقہ بارانی تھا۔

تجارت

یہاں کا دوسرا ذریعہ معاش تجارت تھا (اور ہے) یہ شہر بالخصوص اجناس کی غلّہ منڈی

[۳] حکیم عبدالحی: دہلی اور اس کے اطراف، ۸۵
[۴] کرنال ڈسٹرکٹ گزیٹیر، ص ۱۶۲

کے طور پر مشہور تھا۔ صاحبِ "مخزنِ پنجاب" کے مطابق یہاں کے ساہوکاروں کا کاروبار (بڑا وسیع ہے اور) کئی ملکوں میں پھیلا ہوا ہے اور یہاں کے بازار پُر از تجارت ہیں[۵]۔ قاضی صاحب کے استاد و مربی مرزا مظہر کے مکتوبات سے پتا چلتا ہے کہ یہاں اشیا کے نرخ دہلی سے بہت کم تھے؛ اسی بنا پر مرزا مظہرؒ اکثر اشیا صرف پانی پت سے منگوایا کرتے تھے[۶]۔

وقوعی اہمیت

پانی پت کا یہ شہر اس تنگ نالے میں واقع ہے، جو راجپوتانے کے ریگستان کے شمال مشرقی سرے اور ہمالیہ کے مابین جمنا اور گنگا کی سرسبز و شاداب وادیوں میں داخل ہونے کے لیے کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے ایک طرف راجپوتانے کا طویل و عریض صحرا اور دوسری طرف ہمالیہ کی بلند و بالا چوٹیاں واقع ہیں۔

ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع مردم خیز خطّے (افغانستان) سے جو سب سے سہل راستہ پنجاب کے میدانوں تک آتا ہے وہ درّۂ خیبر، ٹوچی، کرم اور درّۂ گومل کا ہے، تمام شمال مغربی حملہ آور اسی راستے سے دریائے سندھ کو عبور کر کے ہندوستان پر حملہ کرتے رہے ہیں اور چونکہ دہلی دارالسلطنت تھا اور سلاطین اپنے مرکز و مستقر سے نکل کر حملہ آور سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے اسی شہر کا انتخاب کیا کرتے تھے، اسی لیے اس مقام پر تاریخِ ہند کی متعدد لڑائیاں لڑی گئیں۔ تفصیل حسبِ ذیل ہے:

عہدِ قدیم کی مشہور کوروں اور پانڈوں کی جنگ (مہابھارت) جو تھانیسر (پانی پت سے ۴۰ میل دور) کے آس پاس (تقریباً ۴۰، ۴۸ مربع میل کے علاقے میں[۷]) لڑی گئی، اس علاقے

---

۵ تاریخ مخزنِ پنجاب، ص ۶۵۔

۶ دیکھیے مکاتیب (مرتبہ قریشی)، ۱۹۶۶ء، بمواقع عدیدہ

۷ سجان رائے بٹالوی: خلاصۃ التواریخ، مطبوعہ مرکزی اردو بورڈ، (اردو ترجمہ)، ص ۱۵۲

کی پہلی قابلِ ذکر لڑائی ہے۔ مسلم دورِ حکومت میں خاندانِ تغلق کے زمانۂ اقتدار (۷۲۰ھ/۱۳۲۰ء – ۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء)[۸] اور سلطان محمود شاہ بن سلطان فیروز شاہ (م ۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء)[۹] کے زمانۂ حکومت میں بھی یہاں سلطان محمود شاہ بن سلطان فیروز شاہ کے وزیر تاتار خاں اور اس کے حریف سپہ سالارِ نصرت شاہ فضل اللہ بلخی المعروف بہ اقبال خان (م ۸۰۹ھ/۱۴۰۶ء) کے درمیان ایک جنگ لڑی گئی، جس میں مؤخرالذکر فاتح رہا۔[۱۰]

تاہم متاخر عہد میں جو تین خوف ناک جنگیں لڑی گئیں، وہ نتائج کے اعتبار سے زیادہ شہرت کا باعث ہوئیں۔

۱۔ پانی پت کی پہلی جنگ (۷ رجب المرجب ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء)

یہ جنگ لودھی خاندان (۸۵۵ھ/۱۴۵۱ء – ۹۳۰ھ/۱۵۲۶ء)[۱۱] کے آخری فرماں روا ابراہیم بن سکندر لودھی (م ۹۳۰ھ/۱۵۲۶ء) اور سلطان ظہیر الدین بابر (م ۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء) کے مابین لڑی گئی۔ بابر کے اس سے پہلے چار حملے غیر فیصلہ کن رہے تھے۔[۱۲] خوش قسمتی سے دو لودھی امراء دولت خان اور غازی الدین بابر سے آملے تھے۔[۱۳] چنانچہ بابر کی مختصر مگر چاق و چوبند فوج اور سلطان ابراہیم کی ایک لاکھ فوج اور ایک ہزار ہاتھیوں پر مشتمل سواروں کے مابین اسی جگہ گھمسان کا رن پڑا جس میں اگلے کئی سو سالوں کے لیے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ بابر کے حق میں ہو گیا۔ ابراہیم لودھی اس جنگ میں کھیت رہا۔[۱۴] (۷ رجب ۹۳۲ھ/۱۵۲۶ء)

[۸] اسٹینلے لین پول: سلاطین اسلام، مترجمہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق، ص ۲۷۰ تا ۳۰۸، مطبوعہ لاہور

[۹] ولیم طامس بیل: مفتاح التواریخ، ص ۱۱۲

[۱۰] سجان رائے بٹالوی: خلاصۃ التواریخ، ص ۲۵۵ تا ۲۵۶

[۱۱] دیکھیے اسٹینلے لین پول: سلاطین اسلام، بذیل لودھی خاندان

[۱۲] محمد صالح کمبوہ: عمل صالح، ترجمۂ اردو، ص ۲۵۵ تا ۲۵۷

[۱۳] دیکھیے مقالہ ابراہیم لودھی، در اردو دائرۂ معارف اسلامیہ بذیل مادہ۔

[۱۴] محمد صالح کمبوہ: عمل صالح، ص ۲۵۵-۲۵۶، سجان رائے بٹالوی: خلاصۃ، ص ۳۵۸ تا ۳۶۰ (اردو ترجمہ) نیز بابر نامہ، ترجمہ انگریزی، جلد دوم۔

بابر نے فتح کی یادگار کے طور پر ایک مسجد کے علاوہ ایک باغ اور حوض بھی پانی پت میں تعمیر کرایا۔ ہمایوں نے اس جگہ چبوترۂ فتح تعمیر کرایا، اسے باغ کابل کہا جاتا ہے، اس پر " بتاریخ ربیع الاول ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء " کے الفاظ کندہ ہیں۔[۱۵]

۲- پانی پت کی دوسری جنگ (۱۰ محرم الحرام ۹۶۴ھ/۱۵۵۶ء)

پانی پت کے اسی میدان میں ایک مرتبہ پھر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوا، اس مرتبہ یہ جنگ سلطان جلال الدین اکبر (م ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء) اور سلطان محمد عادل (م ۹۶۲ھ/۱۵۵۴ء) کے ہندو سپہ سالار ہیمو بقّال کے درمیان لڑی گئی۔ ہیمو بائیس جنگوں میں فتح یاب ہونے کے بعد پورے ہندوستان پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔[۱۶] مگر اپنی پچاس ہزار فوج، ۱۵ سو ہاتھیوں، ۵۱ بڑی توپوں اور پانچ سو شتر سواروں کے باوجود اکبر کے ہراول دستے سے، جس کی قیادت سکندر خان اوزبک (م ۹۷۹ھ/ ۱۵۷۱ء) اور علی قلی شیبانی (م ۹۷۴ھ/ ۱۵۶۷ء)[۱۷] کر رہے تھے، بری طرح ہار گیا (۹۶۴ھ/ ۱۵۵۶ء)۔

۳- پانی پت کی تیسری جنگ (۱۳ جنوری ۱۷۶۱ء/ ۱۱۷۴ھ)

پانی پت کے اسی میدان میں تاریخ ہندوستان کی تیسری اور انتہائی خوف ناک جنگ احمد شاہ ابدالی (۱۱۸۶ھ/ ۱۷۷۲ء)[۱۸] اور مرہٹہ اقوام کے درمیان لڑی گئی، اس جنگ میں تقریباً دو لاکھ مرہٹے کام آئے، "شاہِ درانی نمودہ باز فتح" اس کا مصرعۂ تاریخ ہے۔[۱۹]

---

[۱۵] کرنال ڈسٹرکٹ گزیٹیر، ص ۲۱۲

[۱۶] دیکھیے شاہ نواز خاں، صمصام الدولہ، مآثر الامرا، ۲: ۸۳ ببعد

[۱۷] ایضاً، ص ۸۳ و ۶۲۲۔

[۱۸] ولیم طامس بیل: مفتاح التواریخ، ص ۳۵۰۔

[۱۹] ایضاً، ص ۳۴۲-۳۴۳، بشیر الدین: واقعات دار الحکومت دہلی، ۱: ۶۶۲-۶۶۴۔

پانی پت کے مشہور اہلِ علم

پانی پت ہندوستان کا مشہور اور مردم خیز شہر ہے، جہاں سے بہت سی ملکی و بین الاقوامی شہرت کی حامل شخصیتوں نے جنم لیا۔ پانی پت کے ان فضلا کا ذکر بہت سی کتب سوانح اور تذکروں کا حصہ ہے، ان میں سے چند مشہور ہستیوں کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ خواجہ عبدالرحمن گازرونی (پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی)[20]

۲۔ مولانا فخر الدین عراقی (چشتی۔ ساتویں صدی ہجری / بارھویں تیرھویں عیسوی)[21]

۳۔ شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتیؒ (۶۰۴-۷۲۴ھ / ۱۲۰۷-۱۳۲۳ء)[22]

۴۔ شیخ شمس الدین ترک پانی پتیؒ (م ۷۱۵ھ / ۱۳۱۵ء یا ۷۱۸ھ / ۱۳۱۸ء)[23]

۵۔ مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاءؒ پانی پتیؒ (م ۱۳ ربیع الاول ۷۶۵ھ / ۱۳۶۳ء)[24]

۶۔ شیخ شبلی بن شیخ جلال الدین پانی پتی صابریؒ (م ۸۵۲ھ / ۱۴۴۸ء)[25]

۷۔ شیخ امان پانی پتیؒ (۸۷۶ھ / ۱۴۷۱ء - ۹۹۷ھ / ۱۵۸۸ء)۔[26]

---

[20] قاضی صاحب کے ایک جدِ امجد (تفصیل کے لیے، محمد میاں، پانی پت اور بزرگانِ پانی پت، ص ۲۰ تا ۲۷)

[21] مشہور پانی پتی بزرگ بوعلی قلندر کے والد (دیکھیے محمد میاں، پانی پت ...، ص ۳۱ تا ۳۲)

[22] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، مفتی غلام سرور، خزینۃ الاصفیا، ص ۳۲۷ و بعد، عبدالحق محدث دہلوی: اخبار الاخیار (اردو ترجمہ) ص ۲۷۹ - ۲۸۱۔

[23] پانی پت کے مشہور بزرگ (دیکھیے خزینۃ الاصفیا، ص ۳۲۱ تا ۳۲۶، محمد عبدالستار بیگ سہسرامی، مسالک، ۲: ۳۴۵ - ۳۴۸)

[24] قاضی صاحب کے جدِ امجد اور مشہور چشتی بزرگ (دیکھیے محمد عبدالستار سہسرامی: مسالک السالکین، ۲: ۳۵۰ تا ۳۵۳، خزینہ، ص ۳۶۱، ۳۶۵۔

[25] شیخ جلال الدین کے صاحب زادے اور جانشین (دیکھیے خزینہ، ص ۳۹۳)۔

[26] صوفی اور توحید پرست بزرگ تھے (عبدالحق، اخبار الاخیار، ص ۴۹۶ - ۴۹۹؛ غوثی مانڈوی، گلزار ابرار، ص ۲۶۶ تا ۲۶۷

۸ - قاضی عبدالغفور پانی پتی رح معاصر شیخ عبدالقدوس گنگوہی رح (م ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء)[۲۷]

۹ - شیخ عبدالملک بن قاضی عبدالغفور رح (دسویں صدی/ سولہویں صدی عیسوی)[۲۸]

۱۰ - قاضی محمود پانی پتی رح (دسویں صدی/ سولہویں صدی عیسوی)[۲۹]

۱۱ - قاضی عبدالقادر پانی پتی ثم اجینی رح (م ۱۰۱۱ھ/ ۱۶۰۲ء)[۳۰]

۱۲ - شیخ نظام الدین بن شیخ عثمان زندہ پیر پانی پتی (م ۱۰۱۸ھ/ ۱۶۹۹ء)[۳۱]

۱۳ - شاہ اعلیٰ چشتی پانی پتی رح (۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۳ء)[۳۲]

۱۴ - شاعر محمد افضل پانی پتی (اوائل گیارھویں ہجری/ سترھویں صدی عیسوی)[۳۳]

۱۵ - ملّا سعد اللہ مسیحا پانی پتی (عہد جہانگیر تا اورنگ زیب عالمگیر)[۳۴]

۱۶ - نواب لطف اللہ خان صادق بہادر تہوّر جنگ (وفات بعہد احمد شاہ)[۳۵]

۱۷ - نواب شاکر خاں پسر نواب لطف اللہ خاں صادق (قاضی صاحب کے ہم عصر)[۳۶]

---

[۲۷] شیخ وقت اور فقیہہ عصر تھے (رکن الدین محمد عبدالقدوس: لطائف قدوسی، ص ۵۵ - ۵۶) -

[۲۸] قاضی عبدالقادر (عدد ۱۱) کے استاد اور مشہور عالم دین (محمد اسحاق بھٹی، فقہائے ہند ۱۴/۲: ۱۲۴)

[۲۹] فقیہہ اور نامور عالم دین تھے - (ایضاً، بمحل مذکور)

[۳۰] قاضی محمود کے بیٹے اور عبدالملک (عدد ۹) کے شاگرد، بہت سے علوم میں تبحّر حاصل تھا
(افکار: ابرار، ص ۴۶۱ تا ۴۶۲؛ فقہائے ہند، ۳/۲ : ۱۲۴)

[۳۱] مشہور چشتی بزرگ (دیکھیے غلام سرور: خزینہ، ص ۴۵۵)

[۳۲] صاحب مراتب اعلیٰ چشتی شیخ تھے (خزینہ، ص ۴۵۹ - ۴۶۱، اللہ دیا: سیر الاقطاب)

[۳۳] مشہور شاعر تھے - گیارھویں صدی میں بکٹ کہانی لکھی جو بہت مقبول ہوئی -
(دیکھیے قائم چاندپوری: تذکرہ، بحوالہ شیرانی: پنجاب میں اردو، ص ۱۷۹)

[۳۴] فارسی کے قادر الکلام شاعر اور مثنوی "رام و سیتا" کے مؤلف (مظفر حسین، روز روشن،
مطبوعہ بھوپال ۱۲۹۷ھ، ص ۲۶۸)

[۳۵] دیکھیے مآثر الامرا ۲، ۳ : ۱۵۳

[۳۶] یہ قاضی صاحب کے ماموں اور ایک اہم تاریخی مخطوطہ "تذکرہ شاکر خان" کے مؤلف ہیں
دیکھیے سرکار: Fall of the Mu..، ۲، ۳، ماخذ)

۱۸۔ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتیؒ (م ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء) ہماری اس کتاب کے موضوع۔

۱۹۔ قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتیؒ (م ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء) [۳۷]

۲۰۔ مولنا راغب اللہ پانی پتیؒ (م ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء)

۲۱۔ خواجہ الطاف حسین حالی (م ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۴ء) [۳۸]

سیاسی پس منظر

عام سیاسی تاریخ

قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا عہد (نواح ۳۔۱۱۴۱ھ / ۲۔۱۷۳۰ء) تا ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء) تقریباً ۸۰۔۸۳ سالوں پر محیط ہے، ہندوستان کی تاریخ کا یہ زمانہ سخت افراتفری اور کشمکش کا زمانہ تھا۔ قاضی صاحب نے جب ہوش کی آنکھیں کھولیں تو ہندوستان پر محمد شاہ رنگیلے کی حکومت تھی اور جب مدت عمر پوری کر کے انتقال کیا تو اس وقت پنجاب اور بعض ساحلی علاقوں کے سوا تمام ہندوستان پر انگریزی راج شروع ہو چکا تھا۔ انھوں نے جس سیاسی ابتری کی حالت میں زندگی بسر کی، اس کا اندازہ وصیت نامے کی حسب ذیل عبارت سے کیا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"فقیر پُر تقصیر کہ جس نے زیادہ تر عمر زمانہ مفاسد میں گذاری۔" [۳۹]

عہدِ محمد شاہی (۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء — ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء) تک مغلیہ سلطنت میں جو زوال و انحطاط آچکا تھا، درحقیقت اس کا آغاز سلطان عالمگیر کی وفات (۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء) سے ہو چکا تھا۔ سلطان عالمگیر کے پہلے جانشین بہادر شاہ اوّل (۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء — ۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ء) سے اس انحطاط کی ابتدا ہوئی، غلام حسین طبا طبائی اس کی نسبت لکھتا ہے:

---

[۳۷] دیکھیے قاری عبدالعلیم انصاری، تذکرۂ رحمانیہ، مطبوعہ پانی پت، ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء

[۳۸] مشہور شاعر اور تذکرہ نویس (اردو دائرۂ معارف اسلامیہ)

[۳۹] دیکھیے کلمات طیبات، مطبوعہ مجتبائی دہلی، ص ۱۵۵

"اس کے زمانے سے اعلیٰ خطاب اور مقتدر عہدوں کی تقسیم حدِ ابتذال کو پہنچ گئی اور مستحق اور غیر مستحق میں کوئی امتیاز نہ رہا ۔۔۔ عہدے اور خطاب اپنا اثر و اعتبار کھو بیٹھے"[٤٠]

اس کے بعد ہندوستان کی مغلیہ سلطنت کے حالات ابتر سے ابتر ہوتے گئے، یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔

محمد شاہ (روشن اختر) کے عہدِ حکومت میں قاضی صاحب کی ولادت ہوئی۔ مجموعی طور پر محمد شاہ اچھا آدمی تھا، مگر اسے کسی معاملے میں دخل اندازی کی اجازت نہ تھی۔ اس کے عہدِ میں حکومت کی رہی سہی ساکھ بھی جاتی رہی، خافی خان اس کے متعلق لکھتا ہے:

"خاندان تیموریہ کا عمل دخل انتظامی امور میں ختم ہو گیا تھا اور سید برادران اور رتن چند (ہندو) کے انتظامی اور ملکی امور پر تسلّط کے باعث کہ جو بارہہ والوں اور سبزی فروشوں کے سوا، کسی کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے، ہر قوم کا چھوٹا بڑا شخص ان سے متنفّر ہو گیا تھا۔"[٤١]

پھر بہت جلد ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ دہلی کی مرکزیت کو سخت نقصان پہنچا۔ سکھوں، مرہٹوں اور جاٹوں کے حملوں اور لوٹ مار کے واقعات میں تیزی آگئی، دوسری طرف امراے دربار خود اپنے جھگڑوں میں مبتلا ہو گئے۔[٤٢]

انھی حالات میں ایرانی حکمران نادر شاہ درانی نے ہندوستان پر حملہ کیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یہ حادثہ (۱۱۵۲ھ/ ۱۷۳۹ء) میں رونما ہوا۔ اس کے فوجیوں کے ہاتھوں قتل ہونے والے نہتے شہریوں کی تعداد ایک لاکھ تک بیان کی جاتی ہے، کئی روز گلیوں اور

---

[٤٠] سیر المتاخرین، مطبوعہ نولکشور لکھنؤ، ۲ : ۳۸۱ و بعد

[٤١] خافی خاں، ۲ : ۹۰۲ و بعد

[٤٢] دیکھیے واقعات دار الحکومت دہلی، آگرہ ۱۳۳۷ھ، ۱ : ۶۴۵-۶۴۶، مہدی بن محمد نصیر استرابادی: تاریخ جہانکشاے نادری، مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۹، ص ۳۵۸۔

سڑکوں کی صفائی میں لگ گئے ۔

اس سے کچھ مدت بعد شمال کی طرف سے ایک اور حملہ ہوا، جس کی قیادت احمد شاہ ابدالی (م ۱۱۸۶ھ/ ۱۷۷۲ء) کر رہا تھا۔ اس میں مدافعانہ جنگ لڑتے ہوئے پہلے وزیر قمرالدین سینے میں گولی لگنے سے چل بسا (۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۷ء)، پھر یہ خبر سن کر محمد شاہ بھی بتاریخ ۲۷ ربیع الاوّل ۱۱۶۱ھ/ ۸۔ ۱۷۴۷ء کو راہی ملک بقا ہوا[۴۳] بعد ازاں سلطنت ہند کا ایک اور رکن ۴ جمادی الاوّل ۱۱۶۱ھ، کو یعنی نواب آصف جاہ بھی موت کی آغوش میں چلا گیا۔ اس طرح ایک ہی سال میں یکے بعد دیگرے تینوں اعیانِ سلطنت وفات پا گئے۔

تاریخ کے اس دور کے واقعات میں بعض دیگر تاریخی عناصر کا بھی بکثرت ذکر ملتا ہے جن میں حسب ذیل واقعات بہت نمایاں ہیں ۔

مرہٹہ گردی

مرہٹے قاضی صاحب[؎] کے عہد کی تاریخ کا سب سے نمایاں اور خوف ناک ترین عنصر رہے ہیں۔ مرہٹہ اقوام بنیادی طور پر علاقہ مہاراشٹر (راجستان) کی رعایا تھیں[۴۴] جنھیں ایک نظام شاہی جرنیل ملک عنبر (م ۱۰۳۵ھ/ ۱۶۲۵ء) نے کسان سے سپاہی بنا دیا تھا[۴۵] اور جنھیں بعد ازاں اورنگ زیب عالمگیر کی شمالی ہندوستان کی مہمات سے چھاپہ مار جنگ کی تربیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس طوائف الملوکی کے زمانے میں مرہٹے تاریخ ہند کا ایک حصہ بن کر ابھرے ۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (۱۱۱۸ھ/ ۱۷۰۷ء) نے ان کے لیے آسانیاں پیدا کر دیں۔ اس کے جانشین بہادر شاہ (م ۱۱۲۴ھ/ ۱۷۱۲ء) نے جیسے ہی "ساہو" کو رہا کیا اس نے

---

[۴۳] مفتاح التواریخ، ۳۲۶؛ سیر المتاخرین، جلد سوم

[۴۴] مقالہ محی الدین اورنگ زیب، در اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ، بذیل بارہ

[۴۵] Cambrige History of India: Sir Haig

اپنے علاقے میں پہنچ کر بہت جلد اپنی سابقہ قوّت بحال کر لی۔ فرخ سیر کے عہدِ حکومت میں امیرالامرا، سید حسین علی خاں نے، جنھیں مرہٹوں کی سرکوبی کے لیے مامور کیا گیا تھا، نہ صرف ان سے مصالحت کر کے پسپائی اختیار کر لی، بلکہ اُنھیں دکن کے صوبوں (خاندیس، برار، اورنگ آباد، حیدرآباد اور بیجاپور) سے چوتھ حاصل کرنے کی اجازت بھی دے ڈالی۔ امیرالامرا کا یہ اقدام مغلیہ حکومت کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہوا۔[۴۶]

نواب نظام الملک آصف جاہ نے تو وقتی طور پر "ریاست حیدرآباد دکن" اور نواحی علاقوں کو ان کی دستبرد سے بچائے رکھا، لیکن دوسرے صوبوں میں حالات ذرا مختلف تھے۔ چنانچہ گجرات میں جب صوبے دار سربلند خان فاتح کنبایچ کو معزول کر کے اس کی جگہ "ابھی جنگ" کو تعینات کیا گیا، تو مرہٹوں نے ایک حشر برپا کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر نواب آصف جاہ نے اُنھیں "تسخیرِ ہند" کی ترغیب دلائی تھی۔ ان کی سرکوبی کے لیے خود بادشاہ نے رجب ۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء کو جمنا عبور کیا، مگر پھر یہ مہم صمصام الدولہ مظفرّ خاں کے سپرد کر دی۔ لیکن ان کو قابو کرنا اب اس کے بس کا روگ نہ تھا۔[۴۷]

مرہٹے بہت خودسر ہو گئے تھے اور خود بادشاہ کے عزل و انتخاب میں ان کا عمل دخل تھا۔ اگر احمد شاہ ابدالی دو مرتبہ اُنھیں شکست دے کر ان کا قتلِ عام نہ کرتا (پہلی مرتبہ بمقام باوّلی ۱۱۷۳ھ/ ۱۷۶۰ء، دوسری بار پانی پت ۱۱۷۴ھ/ ۱۷۶۱ء) تو عین ممکن تھا کہ وہ مغلوں کی اس برائے نام سلطنت کا قصّہ ہی ختم کر ڈالتے اور پایۂ تخت دہلی میں اپنا شاہی سلسلہ قائم کر لیتے۔ پانی پت کی لڑائی کے بعد مرہٹوں نے پھر سر اُٹھایا اور لوگوں کو بہت پریشان کیا۔ ان کی خوں آشامی کا مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے تمام لوگ بلاتفریق مذہب و ملّت شکار تھے۔

چنانچہ اس عہد کی تمام تحریروں میں ان کے ظلم و ستم اور ان کی خوفناکی و دہشت کا

---

[۴۶] صمصام الدولہ، مآثر الامرا: ۳۲۰ (ذکر سید حسین علی خان)، اردو ترجمہ۔
[۴۷] تفصیل کے لیے دیکھیے طباطبائی، سیر المتاخرین جلد ۲ صفحہ ۴۶۱ تا ۴۶۷

حال ملتا ہے، اس سلسلے میں علما اور مشائخ کی تحریرات بھی اس عہد کی بہت اچھی طرح تصویر پیش کرتی ہیں۔

حضرت مظہر کے قاضی صاحب کے نام مکاتیب میں بھی بکثرت مرہٹہ گردی کا ذکر آتا ہے، چنانچہ ان خطوط میں وہ تمام تشویش، بے اطمینانی اور خوف و ہراس کی کیفیت پوری طرح نمایاں ہے جو اس زمانے کے لوگوں کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے متعلق درپیش تھی۔ مثلاً

"چونکہ حدودِ گنگا پار میں مرہٹوں کے متوقع حملے کی بنا پر بہت تشویش ہے ... اس لیے میں پانی پت جانے کا ارادہ رکھتا ہوں"[۴۸]

"اس ہنگامے اور آشوب کے زمانے میں یہاں سے حرکت کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس (دہلی کی) طرف مرہٹوں کی آمد کی خبر زباں زد عوام ہے"[۴۹]

اسی طرح ایک مکتوب میں جو قیاساً ۱۱۸۶ھ/ ۱۷۷۲ء کے زمانے میں لکھا گیا، جب مرہٹہ فوجیں دہلی پر قابض ہو گئی تھیں، حضرت مظہر لکھتے ہیں:

"اس علاقے پر مرہٹوں کے قبضے، قوم روہیلہ کے فرار اور قصبات و دیہات کے تاراج ہونے کے متعلق اور کیا لکھوں"[۵۰]

حضرتِ مظہرؒ کی طرح قاضی صاحب کے خطوط میں بھی مرہٹہ گردی سے تاثر بہت نمایاں ہے، مثلاً:

شاہجہاں آباد (دہلی) کا راستہ پُر خطر ہے۔[۵۱]

تقریباً دس سال سے حکومت پر مرہٹوں کا تسلط ہے۔ گو دنیوی طور پر زیادہ تکلیف

۴۸؎ مکاتیب حضرت مظہر (دریافت شدہ از مکان قاضی صاحب، مرتبہ عبدالرزاق قریشی، مطبوعہ بمبئی ۱۹۶۶ء) ، ص ۴۶، م ۳۴۔

۴۹؎ ایضاً، ص ۴۸، م ۳۵

۵۰؎ مرزا مظہر جانِ جاناں کے خطوط، مرتبہ و مترجمہ انجم، ص ۴۶، م ۵۔

۵۱؎ لوائح خانقاہ مظہریہ، مرتبہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ، حیدر آباد، ۱۹۷۲ء، ص ۲۳۸، م ۱۷۴

نہیں ہے۔ مگر رسوم کفر کا غلبہ اور اہلِ اسلام کی مغلوبیت درویشوں کو بہت کبیدہ خاطر رکھتی ہے۔" [۵۲]

اسی بنا پر قاضی صاحبؒ نے بالخصوص اپنی تفسیر میں "جہاد" پر بڑا زور دیا ہے، کیونکہ مسلمانوں کی مغلوبیت اور پستی کا ایک ہی علاج تھا وہ یہ کہ مسلمان صحیح جذبے سے فریضۂ جہاد ادا کریں۔" [۵۳]

سکھ گردی

قاضی صاحبؒ کے عہد کی سیاست کا ایک اور اہم عنصر پنجاب کے سکھ تھے، جنھیں دسویں گرو گوبند سنگھ (م ۲-۱۰۷۲ھ/ ۱۶۶۱ء، ۱۱۹ھ/ ۱۷۰۸ء) اور بندہ بیراگی (م ۱۱۲۹ھ/ ۱۷۰۶ء) نے فوجی و عسکری تربیت دے کر میدانِ سیاست میں لا کھڑا کیا تھا۔

سکھوں کے دسویں گرو گوبند سنگھ کی پر اسرار موت نے، جسے مغل حکومت کی جانب منسوب کیا گیا ہے، بندہ بیراگی کے لیے سکھوں کی تنظیم سازی آسان کر دی۔ ان کی تاریخ میں پہلی نمود سرہند پر خوف ناک حملے (۱۱۲۱ھ/ ۱۰-۱۷۰۹ء) کی صورت میں ہوئی۔ [۵۴] مرکز حکومت کی کمزوری کے باعث بندہ بیراگی کئی سال تک ادھر اُدھر لوٹ مار کرتا رہا، مگر بالآخر عبدالصمد تورانی گورنر صوبہ لاہور نے اسے گرفتار کر کے فرخ سیر کے حکم سے مع اس کے ہزاروں ساتھیوں کے قتل کر دیا۔ [۵۵] (۱۱۲۵ھ/ ۱۷۱۳ء)

بندہ بیراگی کے قتل سے وقتی طور پر سکھوں کی اس تحریک کو روکنے میں مدد ملی، مگر ۱۷۳۹ء کے حملۂ نادری سے جو مرکزی حکومت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا تھا، اس

---

[۵۲] ایضاً، ص ۲۳۹، م ۱۷۵۔

[۵۳] تفسیر مظہری، ۱: ۲۵۷ تا ۲۵۹، مطبوعہ دہلی، بار دوم، "فصل فی الجہاد"،

[۵۴] خافی خان: منتخب اللباب، بذیل سنہ ۱۱۲۱ھ۔

[۵۵] ایضاً، خافی خاں، بذیل سنہ ۱۱۲۵ھ: History of Sikhs: Cunningham باب اوّل و دوم۔

نے سکھوں کو دوبارہ منظم ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ چنانچہ ۱۷۴۰ء میں سکھوں کے دو جتھے یعنی زیریں ستلجی (cis - satloge)، جو دریائے ستلج کے شمال میں پٹیالہ اور کرنال میں آباد سکھوں کا جتھہ تھا، اور بالائی ستلجی (Trans - satloge) یعنی دریائے ستلج کے شمال مغرب میں لدھیانہ اور لاہور کے مابین آباد سکھوں کا گروہ الگ الگ منظم ہو رہے تھے[۵۶] تاہم حصولِ اقتدار میں اوّل الذکر کو مؤخر الذکر کی نسبت جلد کامیابی حاصل ہوگئی[۵۷] کیونکہ پٹیالہ پران کا راج قائم ہوگیا تھا۔ اس جتھے نے جو جاٹوں کی ہمراہی میں اور دارا نات شاہ کی زیر قیادت تھا۔ ۱۱۵۱ھ/۱۷۴۰ء میں پھر سرہند پر حملہ کیا، مگر عظیم اللہ مغل سپہ سالار کے ہاتھوں مُنہ کی کھائی۔[۵۸]

پھلکیاں مسل کے ایک سردار آلا سنگھ (م ۱۱۷۸ھ/۱۷۶۵ء)، جس نے ازیں قبل سرہند کے نواحی علاقوں پر قبضہ کر کے "ریاست پٹیالہ" قائم کر لی تھی،[۵۹] کے جانشین امر سنگھ کو احمد شاہ ابدالی نے مہاراجہ کا لقب اور ریاست پٹیالہ کا قانونی وارث، اور سرہند کا قلعہ دار تسلیم کر لیا۔[۶۰] چنانچہ انبالہ تک کا تمام علاقہ اس کے ماتحت آگیا۔ پھلکیاں ہی کے ایک اور سردار گجپت سنگھ (م ۱۷۸۶ء) نے "جیند" کی ریاست قائم کر لی تھی، جس کا مرکز شہر پانی پت سے صرف ۴۴ میل کے فاصلے پر تھا۔[۶۱] اسی سردار نے کچھ عرصے تک کرنال پر بھی قبضہ برقرار رکھا تھا۔ اسی مسل کے بعض دوسرے سرداروں مثلاً بھائی دیسو سنگھ (م ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء) نے ۱۷۶۷ء میں کیتھل میں اور متھ سنگھ

۵۶۔ دیکھیے: Fall of the Moghal Emp، ۲: ۴۲۱-۴۲۲

۵۷۔ ایضاً، بمحل مذکور

۵۸۔ ایضاً، ص ۴۲۲، بحوالہ چہار گلزار، قلمی، ورق ۳۷۳ ک۔

۵۹۔ ایضاً، ص ۴۲۲۔

۶۰۔ دیکھیے لدھیانہ ڈسٹرکٹ گزیٹیر، ص ۲۴ تا ۲۷۔

۶۱۔ Fall of the Mughal Empire، ۳: ۱۵۳-۱۵۴

(م ۱۱۹۴ھ/ ۱۷۸۰ء) نے ۱۷۶۴ء میں تھانیسر میں اپنی اپنی ریاستیں قائم کر لی تھیں۔
اس علاقے کی ایک اور "آہلو والیہ" مسل سے تعلق رکھنے والے دو سکھ سرداروں یعنی گردت سنگھ اور صاحب سنگھ (م ۱۷۸۶ء) نے "اروا" میں اپنی ریاست قائم کر لی تھی۔ انہی دونوں سرداروں نے پانی پت کے بھی کچھ گاؤں قبضے میں کر لیے تھے۔ القصّہ اسی طرح کی ریاستیں کپور تھلہ اور نابھہ میں بھی قائم کر لی گئیں تھیں۔[۶۲]

ادھر بالائی ستلج کے سکھوں کو لاہور کے طاقتور گورنر زکریا خاں (م ۱۱۵۸ھ/ ۱۷۴۵ء) نے تو اُبھرنے کا موقع نہ دیا، البتہ معین الملک کے دورِ اقتدار (۱۱۶۱ھ/ ۱۷۴۸ - ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۳ء) بالخصوص احمد شاہ ابدالی کے تیسرے حملے (۱۱۶۵ھ/ ۵۱-۱۷۵۲ء) کے بعد انھوں نے طاقت پکڑنا شروع کر دی۔ معین الملک کی بیوی مغلانی بیگم کا دورِ اقتدار اور اس کے بعد پیدا ہونے والی کشمکش ان کے لیے سنہری موقع ثابت ہوئے۔ چنانچہ اسی دور میں یہاں کے سکھوں نے منظم لوٹ مار کا آغاز کیا۔ اب ان کی ترک تازیاں بعض ہمسایہ ریاستوں کے لیے بھی دردِ سر بن گئیں۔ جیسا کہ بالائی ستلج کے منجا سنگھ کے متعلق بتایا جاتا ہے، اس نے دریائے جمنا کو عبور کر کے زیریں ستلج کے علاقے پر بھی لوٹ مار شروع کر دی تھی۔ یہ سلسلہ دہلی سے سہارن پور اور لدھیانہ تک پھیلا ہوا تھا۔

سکھ اقتدار کے تیسرے مرحلے پر جو بقول سرکار ۱۷۹۴ھ سے شروع ہوتا ہے،[۶۳] بالائی ستلج کے سکھوں میں باہمی نظم و نسق پیدا ہوا اور اس علاقے میں مہا سنگھ کی قیادت میں "سکر چکیاں" مسل نے طاقت پکڑنا شروع کی اور جلد ہی کئی علاقوں پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ رہی سہی کسر اس کے بیٹے راجہ رنجیت سنگھ (م ۱۲۵۵ھ/ ۱۸۳۹ء) نے پوری کر دی۔ جس نے پنجاب اور نواحی علاقوں پر قبضہ کر کے اپنا اقتدار مستحکم کر لیا۔ اسی خاندان سے انگریزوں نے ۱۸۴۵ء میں خونریز جنگوں کے بعد پنجاب کی حکومت چھینی۔[۶۴]

۶۲ـ Fall of the Moghal Empire، ۳: ۱۵۳-۱۵۴

۶۳ـ ایضاً، ۱: ۴۲۱

۶۴ـ مفتاح التواریخ، ص ۳۹۷ - ۴۰۱

سکھ تحریک گو بنیادی طور پر ایک مذہبی تحریک تھی، لیکن اسے بہت جلد سیاسی رنگ دے دیا گیا تھا، جس کے نتیجے میں ان کا مسلمانوں کے ساتھ تصادم ناگزیر ہو گیا تھا، اور یہ صورتِ حال سخت پریشان کن تھی۔

پانی پت تو خاص طور پر سکھ حملوں کی زد میں تھا، چنانچہ حضرت مظہر کے (بنام قاضی صاحب) خطوط میں اس علاقے بالخصوص خاندان قاضی صاحب کے لیے تشویش کا عنصر بڑا نمایاں نظر آتا ہے۔ مثلاً:

کافر سکھوں کی شورش اور قلعہ (غالباً پانی پت) سے ان کی متوقع جنگ کی بنا پر فقیر اور تمھاری والدہ قدرے پریشان ہیں۔"[۶۵]

"پانی پت میں ہمیشہ سکھوں کا فساد بپا رہتا ہے۔"[۶۶]

"اہل شہر کافر سکھوں کے متوقع حملے سے سخت پریشان ہیں۔ خدا تعالیٰ کافروں کو ذلیل اور مسلمانوں کو غالب کرے۔"[۶۷]

"کچھ تو کافر سکھوں کے حملے کا خطرہ ہے اور کچھ کافر مرہٹوں کا ہنگامہ۔ گمان غالب ہے کہ اس سال رمضان المبارک تنہا ہی گذرے گا۔"[۶۸]

"میرا پانی پت جانے کا ارادہ ہے، اگرچہ اس موقع پر بھی سکھوں کے حملے کا خطرہ سننے میں آ رہا ہے۔"[۶۹]

بہرحال سکھوں نے نہایت خطرناک صورت حال پیدا کر دی تھی اور پنجاب کے مسلمان ان سے خاص طور سے پریشان تھے۔ پانی پت کے علاقے پر یہ لوگ ظلم ڈھا رہے تھے۔

---

۶۵ مکاتیب (مرتبہ قریشی)، ص ۱۳۱، م ۹۱۔
۶۶ ایضاً، ص ۴۶، م ۳۴، ص ۴۸، م ۳۵۔
۶۷ ایضاً، ص ۱۰، م ۸، ص ۱۵، م ۱۱۔
۶۸ ایضاً، ص ۴۵، م ۳۳۔
۶۹ ایضاً، ص ۴۶، م ۳۳۔

جاٹ گردی

قاضی صاحبؒ کے عہد کی سیاسی تاریخ میں بھرت پور کے "جاٹ" بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں نے بھی مغلیہ سلطنت کے دورِ زوال میں پر پرزے نکالے، مگر ان کی یہ تحریک اٹھارھویں صدی کے اواخر میں مکمل طور پر کچل دی گئی۔

چورامن جاٹ نے جو محمد شاہ کے عہد میں مرا اورنگ زیب عالمگیر کے آخری دورِ حکمرانی میں لوٹ مار کا پیشہ اختیار کیا تھا، جو اس کے جانشینوں کے زمانے میں مزید تیز ہو گیا۔ اس نے بھرت پور (چودہ میل از اکبر آباد) میں ایک مضبوط قلعہ بنوایا اور تمام دولت یہاں اکٹھی کرنا شروع کر دی۔ اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے بدن سنگھ اور اس کے عزیز سورج مل جاٹ (م ۱۱۷۷ھ/ ۱۷۶۳ء) نے جاٹ قوم کو پہلے سے زیادہ منظم کیا اور حملوں میں زیادہ باقاعدگی پیدا کی۔ مؤخر الذکر نے احمد شاہ۔ عالمگیر دوم اور شاہ عالم کے زمانے کی افراتفری سے خوب فائدہ اٹھایا اور مختلف سیاسی گروہ بندیوں میں شامل رہ کر اپنی قوت میں خاطر خواہ اضافہ کر لیا۔ ۱۱۷۳ھ/ ۱۷۵۹ء میں اس نے مرہٹوں سے ساز باز کر کے دہلی کو لوٹ لیا۔ اس طرح اس نے اپنی دولت بڑھانے کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ یہ اپنی دولت بھرت پور کے علاوہ ڈیگ نامی قلعے میں بھی رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کے عزائم خطرناک دیکھ کر نواب نجیب الدولہ نے اس کو ۱۱۷۷ھ/ ۱۷۶۳ء میں قتل کر دیا۔ اس پر اس کے بیٹے جواہر سنگھ نے عماد الملک اور مرہٹہ فوج کی مدد سے چار مہینوں تک دہلی کا محاصرہ کیے رکھا۔ اہلِ شہر نے ابدالی سے مدد طلب کی، اور اس کی آمد کا سن کر انھوں نے محاصرہ اٹھا کر راہِ فرار اختیار کر لی۔ مگر ابدالی نے ۱۱۸۱ھ/ ۱۷۶۷ء میں اپنے حملۂ ہند کے موقع پر ان کو شکست دی اور انھیں منتشر کر دیا[۵۰] تاہم ان کا مکمل قلع قمع نواب نجف خاں کے ہاتھوں ۱۷۷۳۔۱۷۷۴ء اور ۱۷۷۵۔۱۷۷۶ء کی مہمات کے دوران ہوا۔[۵۱]

---

[۵۰] دیکھیے بشیر الدین، واقعات دار الحکومت دہلی، ۱: ۲۶۱ ببعد؛ مفتاح التواریخ، ص ۳۴۵۔

[۵۱] Fall of the Mughal Empire: sarkar، ۳: ۹۳ تا ۱۰۴ و ۱۰۶۔

بہرکیف جاٹ قوم کے لوگ بھی لوٹ مار اور قتل و غارت گری میں کسی طرح مرہٹوں اور سکھوں سے پیچھے نہ تھے۔ پھر چوں کہ ان کے بیشتر قلعے دہلی کے قرب و جوار میں تھے، اس بنا پر یہ لوگ بآسانی دہلی کی معاشرت اور امن و سکون پر اثر انداز ہو سکتے تھے، چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح نے بعض امرا و سلاطین کے نام جو ایک مفصل اور طویل خط لکھا تھا، اس میں اس گروہ کی چیرہ دستیوں کا بھی ذکر تھا، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں:

" دوسری قوم کافر جٹوں کی ہے، جن کا مسکن دہلی اور اکبر آباد کے درمیان ہے، اور چورامن جو اس قوم کا سردار تھا۔۔۔ دوبارہ محمد شاہ کے زمانے میں سرکشی پر اُتر آیا۔ اسی عہد میں ان کی سرکشی حد سے بڑھی۔ پھر سورج مل، جو چورامن کا چچازاد بھائی ہے، اپنی قوم کا سردار بن گیا اور فساد کا راستہ اختیار کر لیا۔ چنانچہ بیانہ شہر پر جو قدیم زمانے سے مسلمانوں کا شہر چلا آتا ہے اس نے جبراً غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ اور تمام مسلمانوں کو وہاں سے نکال دیا۔ اسی طرح صفدر جنگ، سورج مل کے ساتھ مل گیا اور دونوں متفق ہو کر دہلی پر حملہ آور ہوئے اور تمام اہل شہر کو لوٹا۔ الغرض اس نے دہلی سے دو کروہ پرے کر اکبر آباد تک طولاً اور حدودِ میوات سے لے کر شکوہ آباد تک عرضاً قبضہ جما لیا، اب حالت یہ ہے کہ وہاں کسی کی جرأت نہیں کہ وہ اذان اور نماز کا اہتمام کرے۔ خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کی جماعت قابلِ رحم ہے۔[۴۲]

اگرچہ شہر پانی پت پر جاٹ حملے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، مگر چونکہ صدر السلطنت دہلی براہِ راست ان کے حملوں کی زد میں تھی، اسی لیے دہلی سے ربط و تعلق کی بنا پر قاضی صاحب پر بھی ان کے حملوں کا اثر یقینی طور پر پڑتا رہا۔

روہیلہ گردی

اگرچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت مظہر شہید رح نے ہندوستان میں مسلم تہذیب

---

۴۲ دیکھیے نظامی: شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص۔ ۱۰۲م

کو تباہی سے بچانے کے لیے جن دو طاقتوں پر اعتماد کیا تھا، ان میں سے ایک احمد شاہ ابدالی اور دوسرے "روہیلے"[۵۳] تھے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ روہیلوں کو اسلام اور بزرگانِ اسلام سے سچی محبت تھی۔ چنانچہ حضرت مظہرؒ کے یہاں بکثرت اُن کی آمد و رفت اور سلسلۂ بیعت تھا، اور یہ لوگ قاضی صاحبؒ سے بھی عقیدت رکھتے تھے، اور یہ بھی درست ہے کہ اس قوم میں نواب نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں جیسے اولوالعزم مجاہد پیدا ہوئے، مگر دوسری طرف یہی روہیلے لوٹ مار اور قتل و غارت گری میں بھی بُری طرح بدنام تھے۔ اس بنا پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے جب نواب نجیب الدولہ کی جرأت و شجاعت کی وجہ سے اسے رئیس المجاہدین کے عنوان سے عزّتِ خطاب بخشی تو یہ جملہ بھی لکھا :

"باقی جب شاہی فوجیں دہلی پر قابض ہو جائیں تو اس بات کا مکمل اہتمام کیا جائے کہ مثلِ سابق کوئی شخص ظلم سے پامال نہ ہو۔"[۵۴]

دراصل روہیلوں کی حالت نادان دوستوں کی سی تھی جو دوستی کے رنگ میں بھی ایک گونہ عداوت مضمر رکھتے ہیں، اسی بنا پر حضرت مظہر بھی ان سے نالاں تھے کیونکہ ان کی دست درازیوں سے دہلی اور پانی پت دونوں ہی محفوظ نہ تھے، چنانچہ حضرت مظہرؒ کے خطوط میں ان کے متعلق بکثرت شکایات ملتی ہیں، مثلاً قاضی صاحب کو لکھتے ہیں :

"صاحبِ من روہیلے آدمی نہیں ہیں۔ گو وہ حضرتِ آدم ہی کی اولاد ہیں اور میرا مزاج جیسا کہ آپ کو معلوم ہے قطعاً کسی کی رعایت نہیں کرتا۔"[۵۵]

حضرت مظہرؒ کے مطابق یہ لوگ بالکل اعتماد کے لائق نہ تھے، دوستی کے رنگ میں

---

[۵۳] افغانستان میں ایک وسیع سلسلۂ کوہ "روہ" کے نام سے معروف ہے، جس کے شمال میں کوہ کاشغر، جنوب میں بھکر اور بلوچستان، مشرق میں کشمیر اور مغرب میں دریائے ہلمند ہے۔ یہاں کے باشندے روہیلہ کہلاتے ہیں۔ (الطاف بریلوی، حیاتِ حافظ رحمت خاں ص ۴۲)

[۵۴] شاہ ولی اللہ کے خطوط (نظامی)، ص ۲۱، م ۶، ص ۲۲، م ۷

[۵۵] مکاتیب (قریشی)، ص ۱۵۶، م ۱۰۳

بھی دشمنی کر جاتے تھے، ایک مرتبہ حضرت مظہر کی اہلیہ "مردم محل" کی کچھ مزروعہ زمین کو فصل پکنے کے قریب موسم میں راہ چلتے چلتے پامال کردیا :

"اچانک روہیلہ فوج نے اس علاقے پر حملہ کر دیا، جس کی بنا پر نہ خریف ہوئی اور نہ ربیع"[۷۶]

روہیلوں کو اگر ایک طرف یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے ایک رئیس نواب نجیب الدّولہ نے مرہٹوں کی سرکوبی میں نمایاں خدمات انجام دیں تو دوسری جانب ان پر یہ الزام بھی ہے کہ ان کے بعض اخلاف مثلاً نواب ضابطہ خان اور غلام قادر روہیلہ وغیرہ نے سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں سے ساز باز کر کے سلطنتِ دہلی کی مشکلات میں اضافہ کیا ۔ غلام قادر روہیلہ کا شاہ عالم کی آنکھیں نکالنے کا واقعہ تو اس قوم کی تاریخ کا انتہائی تاریک باب ہے ۔ اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ نے اس قوم سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں ۔

انگریز راج

قاضی محمد ثناء اللہ ؒ کے زمانے کا ایک نہایت اہم واقعہ انگریزی حکومت کا برصغیر پاک و ہند میں قیام ہے ۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے انگریزوں کو طویل جدّوجہد کرنا پڑی — ۹۰۴ھ/ ۱۴۹۸ء میں جب واسکوڈی گاما نے ہندوستان کے لیے یورپ سے سفر کا آسان بحری راستہ تلاش کیا تو ہندوستان میں یورپین اقوام کی آمدورفت شروع ہوئی ، سیاسی اعتبار سے چونکہ یورپ میں یہ زمانہ بیداری کا تھا ، اسی بنا پر اس دریافت کے ذریعے یورپین اقوام کو برّصغیر پر اپنا قبضہ مستحکم کرنے کا خیال پیدا ہوا ۔ چنانچہ ۹۱۶ھ/ ۱۵۱۰ء میں پرتگالیوں نے ریاست بیجاپور کے ایک جزیرے "گوا" پر زبردستی قبضہ کر لیا[۷۷] مگر بہت جلد

---

۷۶ مکاتیب (قریشی) ، ص ۱۵۶ ، م ۱۰۳

۷۷ آکسفرڈ ہسٹری آف انڈیا ، ص ۳۳۱ تا ۳۳۲

فرانسیسی اور برطانوی بحری بیڑوں نے پرتگالیوں کو اس علاقے کی سیاست اور تجارت سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا اور خود اپنی تجارتی کمپنیاں قائم کر کے دور رس منصوبہ بندی کے ذریعے اس علاقے پر بالا دستی قائم کرنے کی کوششوں کا آغاز کر دیا،[۸] مگر ان میں برطانیہ کے انگریز زیادہ کامیاب ثابت ہوئے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ حکومت میں انگریزوں کی سرگرمیاں تیز ہو گئی تھیں، یہ لوگ بظاہر ایسٹ انڈیا کمپنی کے پرمٹ پر تجارت کرتے تھے، مگر فی الواقع اقتدار پر قبضہ کرنے کے ارادے رکھتے تھے۔ ان کے بنگال کے مغل گورنر شائستہ خاں سے ہگلی، مٹیا برج، کلکتہ اور بالا سور وغیرہ کے مقامات پر متعدد معرکے ہوئے، مگر چونکہ مغلوں کی بحریہ بے حد کمزور واقع ہوئی تھی، اس بنا پر یہ لوگ ہر تادیبی کارروائی سے محفوظ رہے۔ اپنی طاقت ور بحریہ کے بل بوتے پر یہ لوگ حاجیوں کے قافلوں کو لوٹ لیتے تھے۔ اس کے علاوہ جوڑ توڑ کے بھی ماہر تھے، اسی بنا پر اورنگ زیب عالمگیر کی وفات تک کلکتہ، مدراس، بمبئی اور سورت میں متعدد تجارتی کوٹھیوں کے نام سے قلعے تعمیر کر چکے تھے جس میں ہر قسم کا آتشیں اسلحہ رکھا جاتا تھا۔[۹]

مغلیہ حکومت کے دورِ طوائف الملوکی میں اُنھوں نے اور بھی اپنی قوّت میں اضافہ کر لیا۔ علاوہ ازیں سیاسی جوڑ توڑ میں مہارت کی بنیاد پر آہستہ آہستہ اپنے مقبوضات میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ جب ۱۱۲۹ھ / ۱۷۱۶ء میں بادشاہ فرخ سیر بیمار ہوا تو اس کا علاج ایک انگریز ڈاکٹر "ہملٹن گیرل" نے کیا تھا، جس کی خواہش پر بادشاہ نے کمپنی کا محصول معاف کر دیا۔

بعد ازاں اُنھوں نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کرتے پہلے نواب سراج الدولہ کو (۱۷۵۷ء میں) پلاسی کے میدان میں اور پھر نواب شجاع الدولہ اور شاہ عالم

---

[۸] دیکھیے مولانا حسین احمد، نقشِ حیات، ج ۱

[۹] دیکھیے: ہاشمی فرید آبادی، تاریخ مسلمانانِ پاکستان و ہند، جلد اول و دوم۔

کی متحدہ فوج کو ۱۱۷۸ھ/۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر شکست دے کر ہندوستان میں اپنے قدم مضبوطی سے جمالیے اور بادشاہ کو اپنا باجگذار بنا کر تمام بنگال کی دیوانی کے حقوق دو لاکھ روپے میں حاصل کر لیے۔ تاہم سلطان میسور فتح علی ٹیپو کے خلاف کامیابی حاصل کرنے میں انھیں خاصی جدّ و جہد کرنا پڑی۔ مگر بالآخر ۲۸ ذوالقعدہ ۱۲۱۳ھ/۱۷۹۹ء کو سلطان ٹیپو کی آخری پناہ گاہ سرنگا پٹم بھی فتح ہوگئی اور شیر میسور قتل کر دیا گیا۔ اس سے انگریزوں کے حوصلے اور بڑھ گئے، اب ویسے بھی ہندوستان میں ان کے مقابلے کی کوئی طاقت باقی نہ رہی تھی، چنانچہ لارڈ لیک نے ۱۸۰۳ء میں دہلی اور ۱۸۰۵ء میں دوآبہ کا تمام علاقہ (بشمول پانی پت) اپنی تحویل میں لے لیا اور اس طرح ہندوستان کے دورِ غلامی کا آغاز ہوا۔[۲۸]

قاضی صاحبؒ کا سیاسی شعور

قاضی صاحبؒ اپنے عہد کے حالات و واقعات پر گہری نظر رکھتے تھے، آخر کیوں نہ ہو، آپ نے دو عظیم القدر اساتذہ یعنی شاہ ولی اللہ اور حضرت مظہرؒ سے تربیت پائی تھی۔ چنانچہ آپ کے مکتوبات سے اس عنوان پر نہایت اعلیٰ نوعیت کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ہم ذیل میں قاضی صاحب کا ایک خط نقل کر رہے ہیں جو قیاساً ۱۲۱۶ھ/۱۷۹۶ء کا تحریر کردہ ہے، اس خط میں سیاسی حالات کا بنظر عمیق تجزیہ کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"فقیر اپنے اہل و عیال سمیت بخیر و عافیت ہے، لیکن کفار کے غلبے سے سخت پریشان ہے۔ عہد سابق میں کافی عرصے سے ہندوستان میں اسلام کمزور چلا آتا ہے۔ کافی دیر رافضیوں کی وکالت (مراد نجف خاں کی وزارت ہے) اور کافر سکھوں کے حملے کی تشویش رہی۔ تقریباً دس سال سے مرہٹوں

---

[۲۸] بشیر الدین: واقعات دار الحکومت دہلی، ۱: ۶۲۷۔

کا تسلّط ہے۔ گو دنیوی اعتبار سے چنداں تکلیف نہیں ہے، مگر رسوم کفریہ کے غلبے اور اہلِ اسلام کی مغلوبیت درویشوں کو پریشان خاطر رکھتی ہے۔ بادشاہِ اسلام اور مسلمانوں کے لشکر جہاد اور اعلائے کلمۃ اللہ کی توفیق نہیں رکھتے۔ مسلمانوں کے درمیان آپس میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے۔ عہد سابق میں چند مرتبہ احمد شاہ درانی، خدا اسے اپنی رحمت میں آسودہ کرے، ہندوستان آیا اور مسلمانوں کے ضعف میں مزید اضافے کا باعث بنا اور کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔ مسلمانوں کے سردار اس سے برہم ہو گئے اور ملک (صوبہ) لاہور اور سرہند سکھوں کے قبضے میں چلے گئے۔ انھوں نے بزرگوں کے مزارات کو شہید کر دیا اور سخت فتنہ بپا کیا اور ان کا کوئی تدارک نہ ہو سکا۔ اب سننے میں آرہا ہے کہ شاہ امان (اللہ) جہاد کے اراد سے سے اس جانب آرہا ہے۔ خدا کرے مسلمان مغلوب نہ ہوں اور کفار کا فتنہ جڑ سے اکھڑ جائے اور اسلام اور مسلمانوں کا غلبہ رونما ہو۔"[۸۱]

اخلاقی تنزّل و انحطاط

قاضی صاحب کے زمانے میں برّصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو سیاسی تنزل ہی کا نہیں، اخلاقی پستی کا بھی وسیع پیمانے پر سامنا تھا۔ اسی بنا پر قاضی صاحب اور اس عہد کے دیگر مصلحین نے معاشرے کی اخلاقی حالت سدھارنے پر بھی توجّہ مبذول کی۔

وصیت نامے میں اس تنزل و انحطاط کا ذکر وہ یوں فرماتے ہیں:

"چونکہ زمانہ ہر قسم کے فتنہ و فساد سے بھرا ہوا ہے... فقیر پُر تقصیر کہ جس نے زیادہ تر عمر زمانۂ فاسد میں گذاری ہے"[۸۲]

اخلاقی تنزل کی تفصیلات اس دور کی کُتبِ تاریخ میں موجود ہیں۔

---

[۸۱] دیکھیے لوائح خانقاہ مظہریہ. (غلام مصطفیٰ خاں)، ۲۳۸۔ ۲۳۹، م ۱۷۵

[۸۲] وصیت نامہ در کلمات طیبات، ص ۱۵۳۔

رشوت ستانی

اس دور کے ہمہ گیر اخلاقی و ذہنی بگاڑ کا نتیجہ رشوت ستانی اور اسی قسم کی دیگر معاشرتی اور سماجی برائیوں کی صورت میں ظاہر ہوا، اور اس نے حکومت کے نظم و نسق پر بڑا بُرا اثر ڈالا۔ عام افسران اور عمالِ حکومت تو اپنی جگہ، خود عمائدِ سلطنت بھی بُری طرح اس لعنت میں گرفتار تھے، چنانچہ مشہور مؤرخ خافی خاں نے سید عبداللہ پر دیگر امور کے ساتھ "اخذ رشوت" کا الزام بھی عائد کیا ہے[۸۳] امرا اور حکومت کی جانب سے طرح طرح کے بہانوں سے عوام الناس کو لوٹنے اور مال ہتھیانے کا لامتناہی سلسلہ چل نکلا تھا، اس کی تفصیل مختلف کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اسراف اور دولت کا بے جا استعمال بھی سرکاری گھرانوں میں عام تھا۔

ضعیف الاعتقادی

عملی اور اخلاقی بگاڑ پر ذہنی اور اعتقادی ژولیدگی مستزاد تھی۔ ایمان کے یقین راسخ کی جگہ ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی پوری طرح معاشرے کے تمام طبقات پر چھا چکی تھی۔ ایرانی، ہندوی اور دیگر مقامی اثرات کے تحت اہلِ اسلام نے بے شمار بدعات اپنا لی تھیں۔ قبر پرستی اور عرس منانے کی رسوم، جس کے خلاف قاضی صاحب نے ارشاد الطالبین میں بہت کچھ لکھا ہے[۸۴] بہت زیادہ مقبول تھیں[۸۵] ان کو فرائض کی طرح بجا لایا جاتا تھا جب کہ فرائض سے غفلت برتی جاتی۔

---

۸۳ منتخب اللباب ۲، ۹۴۱ (۱۱۳۴ھ)

۸۴ دیکھیے ارشاد الطالبین، مقام دوم، نیز حصہ سوم، باب تصوف

۸۵ دہلی اور اس کے اطراف میں متعدد عرس بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے، تفصیل کے لیے دیکھیے مرقع دہلی، ص ۲ (قدم مبارک)، ص ۱۲ (عرس خلد منزل)، ص ۳۳ (ذکر یازدہم میران)

خود حکمرانوں کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی، چنانچہ ایک وقائع نویس خوشحال چند نے لکھا ہے کہ "جہاندار شاہ اور اس کی محبوبہ لعل کنور حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کی باؤلی میں اس خیال کے تحت برہنہ نہایا کرتے تھے کیونکہ اس طرح نرینہ اولاد ہونے کی امید کی جاتی تھی"[۸۶] اسی ضعیف الاعتقادی نے ایک مغل حکمران یعنی عالمگیر دوم کی جان لے لی۔[۸۷]

تصوّف کی غلط اور مہمل تشریحات

تصوف، جو لوگوں کی تعلیم و تربیت کا نہایت مربوط و مستحکم سلسلے کا نظام تھا، اس دور میں بعض جاہل اور ان پڑھ سجادہ نشینوں کے ہاتھوں اپنی حیثیت کھو رہا تھا۔ اوّل تو یہ ادارے برائے نام تھے، جو تھے بھی، ان میں بھی باستثنائے چند، تصوف کے نام پر جو کچھ بتایا جاتا تھا اسے تصوّف سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا، چنانچہ ان کا شکار ہونے والے لوگ دین اور دُنیا دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ بعض لوگ شریعت و طریقت کو دو مختلف طریقہ ہائے دین سمجھتے تھے، اس طرح کے خیالات کے پھیلنے سے رہی سہی کسر بھی پوری ہو رہی تھی۔

حضرت مجدّد الف ثانی کی تحریک احیائے دین کی باقیاتِ صالحات

عین ان حالات میں جب کہ مسلمانوں پر بری طرح زوال و انحطاط کے اثرات ظاہر ہونے لگے تھے۔ قلب ہند دہلی سے اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور اس کے احیا کی طاقت ور آواز ابھری، اور ایک دینی و فکری تحریک کا آغاز ہوا۔ یہ تحریک نئی نہ تھی، اس کی ابتدا حضرت مجدد الف ثانیؒ (۹۷۱ھ/۱۵۶۴ء — ۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء) عہدِ اکبری و عالمگیری میں کر چکے تھے۔

---

[۸۶] دیکھیے Later Mughals: irvine ، ۱: ۱۹۶ بحوالۂ خوشحال چند: نادر الزمانی (قلمی)۔

[۸۷] واقعات دار الحکومت دہلی، ۱: ۶۶۰-۶۶۱